19

علامہ اقبالؒ کے معاشی نظریات

انسانی زندگی میں معاشی مسئلہ کو جو اہمیت حاصل ہے علامہ اقبال ایک ذہین و فطین فلسفی کی حیثیت سے اس سے پوری طرح واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے ہر مرحلے پر اس مسئلہ پر مناسب توجہ دی۔ اپنے زمانے کے شعراء میں اقبال کو جو امتیازی خصوصیات حاصل ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے انسانی اور قومی زندگی کے اس اہم پہلو پر کما حقہٗ توجہ دی اور نثر کے علاوہ اپنے کلام معجز نما کے ذریعے سیاسی و سماجی رہنماؤں کو اس کی طرف متوجہ کیا۔

علم الاقتصاد

۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۳ء کے عرصے میں اقبال اورنٹیئل کالج لاہور میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے اور اس دوران B.O.L کلاس کے طلبہ کو تاریخ و فلسفہ کے علاوہ POLITICAL ECONOMY کے نکات و معارف سے آگاہ کرتے رہے اور مذکورہ کالج کی ایک رپورٹ مظہر ہے کہ اس مدت میں انہوں نے اقتصادیات کے موضوع پر واکر WALKER کی کتاب POLITICAL ECONOMY کی تلخیص اور اردو ترجمہ بھی کیا۔ اسی طرح ایک اور کتاب "علم الاقتصاد" کے نام سے ۱۹۰۱-۲ء میں لکھی[1] جو ۱۹۰۳ء میں اس وقت شائع ہوئی جب کہ آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ اس سلسلے میں یہ بات بہت دلچسپ ہے کہ نہ صرف یہ کہ اردو زبان میں معاشیات پر کسی ہندوستانی کی یہ پہلی کتاب ہے بلکہ انگریزی زبان میں بھی اس وقت تک کسی ہندوستانی نے غالباً اس موضوع پر قلم نہ اٹھایا تھا۔ نیز یہ کہ اس کے مصنف نے اس سے پہلے کسی تعلیمی ادارے سے یہ مضمون بھی نہیں پڑھا تھا۔ اردو میں اس موضوع پر پروفیسر الیاس برنی نے "علم المعیشت" کے نام سے جو کتاب لکھی وہ ۱۹۱۶ء میں انجمن ترقی اردو نے

---

[1] کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ از ڈاکٹر وحید قریشی صفحہ ۲۲۸ (مقالہ: علامہ اقبال کی تعلیمی زندگی کی بعض تفصیلات)

20

شائع کی اور اس کے بعد حیدر آباد میں دار الترجمہ قائم ہوا۔ اُردو میں علمی اصطلاحات وضع ہونے لگیں اور پھر جامعہ عثمانیہ کے قیام سے اُردو میں معاشیات پر بھی کتابوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس پس منظر میں علامہ اقبال کی اس علمی کاوش کی قدر و قیمت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

اس حقیقت کے باوجود کہ یہ اُردو میں پہلی کوشش ہے نیز علامہ اقبال کی جوانی کے دور کی علمی کاوش ہے اور اس وقت سے لے کر آج تک درجنوں کتابیں اس موضوع پر لکھی جا چکی ہیں اور معاشیات میں ترقی و انقلاب کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری ہے۔ اقبال کے مطالعہ کی گہرائی اور رائج الوقت اقتصادی نظریوں پر ان کی تنقید کی داد نہ دینا یقیناً ناانصافی ہوگی۔

معاشی مسئلہ کی اہمیت

اس کتاب میں اقبال نے علم معاشیات کی ماہیت و اہمیت، قومی معیشت، زمین، محنت، سرمایہ، مسئلہ قدر، منافع اُجرت، مال گزاری، لگان، سود، آبادی اور تجارت بین الاقوام پر مفید بحث کی ہے۔ اقبال کی نظر میں معاشی مسئلہ کی اہمیت کیا تھی ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"..... اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سیل رواں میں اصول مذہب بھی بے انتہا مؤثر ثابت ہوئے ہیں، مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندہ ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے چپکے اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔"

غربت و افلاس

پھر غربت و افلاس پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:۔

"ذرا خیال کرو کہ غریبی یا یوں کہو کہ ضروریات زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرز عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قویٰ انسانی پر بہت بڑا اثر ڈالتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلا آئینہ کو اسقدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلم اوّل یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدن انسانی کے قیام کے لئے ضروری جزو ہے، مگر مذہب اور زمانہ حال کی تعلیم کے انسان کی جبلی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوت مدارج بجائے اس کے کہ قیام تمدن کے لئے ایک ضروری جزو ہو اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت

21

مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اس طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظم عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے؟" [1]

دولت کا مقصد

لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس امر پر بھی زور دیتے ہیں کہ دولت کا مقصد انسان کو اعلیٰ مقاصد حیات کے قابل بنانا ہے نہ کہ اسے عیش پسندی اور لذت پرستی کا عادی بنانا۔

"بعض اشیا جن سے عارضی لذت حاصل ہوتی ہے انسانی زندگی کو تازگی اور شگفتگی بخشنے کے لئے ضروری ہوتی ہیں لیکن اس کے برخلاف یہ بھی سچ ہے کہ بعض پرانی مہذب قوموں کی بربادی عارضی لذت کی جستجو اور ان اشیا سے بے پروا رہنے کی وجہ سے ہوئی جن سے انسانی زندگی کو حقیقی قوت (؟) اور جلا حاصل ہوتی ہے۔ زمانۂ حال کی تہذیب اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے کہ لذیذ اور مفید میں امتیاز کیا جائے تاکہ ہمیں زندگی کی اصل غرض یعنی بہبودی بنی نوع انسان کے حصول میں آسانی ہو۔" [2]

علم الاقتصاد اور علم الاخلاق

وہ علم الاقتصاد کو علم الاخلاق سے متعلق قرار دیتے ہیں:۔

"خوراک، لباس، مکان ہماری زندگی کے لئے ضروری ہیں اور ان کی قدر ان کے مقاصد کی قدر پر منحصر ہے جن کو یہ پورا کرتے ہیں مگر زندگی کے ان معمولی مقاصد کی اصلی وقعت صرف اس صورت میں معلوم ہو سکتی ہے جب ہم ان پر زندگی کے افضل ترین مقصد کے لحاظ سے غور کریں۔ اس لئے علم الاقتصاد کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے کسی قدر مطالعہ علم الاخلاق کا بھی ضروری ہے۔ اکثر مصنفین نے اس صداقت کو محسوس نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا

---

[1] دیباچہ "علم الاقتصاد" از شیخ محمد اقبال صفحہ ۲۳، ۲۴

[2] علم الاقتصاد از شیخ محمد اقبال حاشیہ صفحہ ۱۲

کہ دولت بالحاظ زندگی کے افضل ترین مقصد کے بجائے خود ایک مقصد تصور کی گئی جس سے بعض تمدنی اصلاحوں کے ظہور پذیر ہونے میں بے جا تعویق ہوئی اور دولت کے پیار کرنے والوں کی حرص و آز پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی۔"[1]

اس کے بعد انہوں نے واضح کیا کہ کسی شے کی حقیقی قدر و منزلت اس امر پر منحصر ہے کہ وہ کہاں تک ہماری زندگی کے اعلیٰ ترین مقصد کے حصول میں ہم کو مدد دیتی ہے۔ اگر دولت ہمارے افضل ترین مقاصد کے حصول میں ہم کو مدد نہیں دے سکتی تو یہ بے فائدہ ہے۔ کیونکہ دولت یا سرمایہ بھی مقصدِ حیات نہیں بلکہ ذریعۂ حیات ہے۔[2]

معاشی نظام میں سرمایہ کی اہمیت

معاشی نظام میں سرمایہ کی اہمیت ان لفظوں میں آشکار کرتے ہیں:۔

"نوع انسانی کے ابتدائی مراحل تہذیب میں سرمایہ کا وجود مطلق نہ تھا۔ پیداوار دولت کے صرف دو وسائل تھے یعنی محنت اور زمین۔ مگر موجودہ نظام تمدن میں سرمایہ دولت کی پیدائش کے لئے ایسا ہی ضروری ہو گیا ہے جیسا کہ محنت اور دیگر قدرتی اسباب اس لئے دولت کی پیدائش ناممکن ہے جبتک کہ موجودہ صرف میں سے کچھ حصہ بچا کر مزید دولت پیدا کرنے میں استعمال نہ کیا جائے، لہٰذا نظام تمدن کی موجودہ صورت میں کسی ملک کا سرمایہ اس ملک کی دولت کا وہ حصہ ہے جو دولت کی آئندہ پیدائش کے لئے الگ رکھا جائے۔"[3]

پیداوار دولت کے حصہ دار

کتاب کے چوتھے حصے میں پیداوار دولت کے حصہ داروں پر بحث کرتے ہوئے لگان اور سود کو بھی شامل کیا ہے۔ لگان پر اقبال نے اپنے خیالات کا جس طرح اظہار خیال کیا ہے اس سے مسئلہ ملکیت زمین کے بارے میں ان کے رویے کی وضاحت ہوتی ہے نیز معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں وہ اشتراکی تصور سے اس وقت بھی نا آشنا نہ تھے۔

تمدن انسانی کی ابتدائی صورتوں میں حق ملکیت یا جائداد شخصی کا وجود مطلق نہ تھا۔ محنت کی پیداوار میں حسب ضرورت ہر شخص کا حصہ تھا۔ ہر شے ہر شخص کی گویا ملکیت تھی اور کوئی خاص فرد یہ دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ خاص شے میری ملکیت ہے

---

[1] علم الاقتصاد از شیخ محمد اقبال صفحہ ۲۱ [2] علم الاقتصاد از شیخ محمد اقبال صفحہ ۲۱

[3] علم الاقتصاد از شیخ محمد اقبال صفحہ ۴۷

23

اور یہ کسی اور کی۔ نہ کہیں افلاس کی شکایت تھی نہ چوری کا کھٹکا تھا۔ قبائل انسانی مل کر گزران کرتے تھے اور امن و صلح کاری کے ساتھ اپنے دن کاٹتے تھے۔ یہ مشارکت اس ابتدائی تمدن میں انسان کا اصول معاشرت تھی ہمارے ملک کے اکثر دیہات میں اس وقت بھی کسی نہ کسی صورت میں مروّج ہے۔ زمانہ حال کے بعض فلسفی اس بات پر مُصر ہیں کہ تمدن کی یہی صورت سب سے اعلیٰ اور افضل ہے۔ نظام قدرت میں نوع انسانی کے تمام حقوق مساوی حقوق رکھتے ہیں۔ کوئی کسی کا وکیل نہیں ہے اور تمام تمدنی امتیازات مثلاً سرمایہ دار اور محنتی، آقا و ملازم وغیرہ بالکل بے معنی ہیں۔ جائداد شخصی تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے۔ لہٰذا اقوامِ دُنیا کی بہبودی اسی میں ہے کہ ان بے جا امتیازات کو یک قلم موقوف کر کے قدیمی اور قدرتی اصول مشارکت فی الاشیاء کو مروّج کیا جائے اور کچھ نہیں تو کم از کم ملکیت زمین کی صورت میں ہی اس اصول پر عملدرآمد کیا جائے کیونکہ یہ شے کسی خاص فرد یا قوم کی محنت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ قدرت کا ایک مشترکہ عطیہ ہے جس پر قوم کے ہر فرد کو مساوی حق ملکیت حاصل ہے۔ حال کی علمی بحثوں میں یہ بحث بڑی دلچسپ اور نتیجہ خیز ہے لیکن ہم اس کا مفصل ذکر اس ابتدائی کتاب میں نہیں کرنا چاہتے یہاں صرف اس قدر یاد رکھنا چاہیئے کہ نظام تمدن کی موجودہ صورت میں جائداد شخصی ایک ضروری جزو ہے اور پیداوار محنت یعنی دولت کی تقسیم اسی کی رُو سے ہوتی ہے"۔ [1]

اضافہ آبادی کے معاشی اثرات

آبادی میں قدرتی اضافے کی بدولت ایک محدود طبقے کی آمدنی میں جس طرح اضافہ ہوتا ہے اقبال اس کو مذموم خیال کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ بعض معاشی محققین کی یہ رائے بھی پیش کرتے ہیں کہ یہ خرابی شخصی ملکیت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے لہٰذا اس کا علاج قومی ملکیت ہے:۔

"مزید برآں یہ امر بھی ظاہر ہے کہ جوں جوں آبادی بڑھتی ہے ضرورت ان زمینوں کو کاشت میں لانے پر مجبور کرتی ہے جو اس سے پہلے غیر مزروعہ پڑی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو زمینیں افزائش آبادی سے پیشتر کاشت کی جاتی تھیں ان کا لگان بڑھ جاتا ہے۔ زمیندار روز بروز دولت مند ہوتے جاتے ہیں حالانکہ یہ مزید دولت جو ان کو ملتی ہے نہ ان کی ذاتی کوششوں اور نہ ان کی زمینوں کے محاصل کی مقدار بڑھنے کا نتیجہ ہوتی ہے بلکہ صرف آبادی کی زیادتی سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کی ذاتی کوششیں اور ان کی زمینوں کے محاصل

---

[1] علم الاقتصاد از شیخ محمد اقبال صفحہ ۱۴۷، ۱۴۸

24

کی مقدار میں کوئی فرق نہیں آتا۔ پھر ان کا کوئی حق نہیں کہ وہ دولت مند ہوتے جائیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ آبادی کی زیادتی سے قوم کے خاص افراد کو فائدہ پہنچے اور باقی قوم اس سے محروم رہے۔ اگر یہ فائدہ ان کی ذاتی کوششوں یا ان کی زمینوں کے محاصل کے بڑھ جانے کا نتیجہ ہوتا تو ایک بات تھی لیکن جب ان کی دولت مندی کے یہ اسباب نہیں ہیں تو صاف ظاہر ہے کہ ان کی امیری صریحاً اصول انصاف کے خلاف ہے۔ ان نتائج کو ملحوظ رکھ کر بعض محققین نے بڑے زور شور سے ثابت کیا ہے کہ یہ سب ناانصافی جامداد شخصی سے پیدا ہوتی ہے جس کا وجود قومی بہبودی کے لئے انتہا درجے کا مضرت رساں ہے۔ پس حکمار کے اس فریق کے نزدیک زمین کسی خاص فرد کی ملکیت نہیں بلکہ قومی ملکیت ہونی چاہیئے یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ لگان کی کہ یہ زائد مقدار جو آبادی کی زیادتی کے سبب پیدا ہوتی ہے سرکار یا قوم کا حق ہے نہ کہ زمینداروں کا۔" [1]

تجدید آبادی

کتاب کے پانچویں حصے میں انہوں نے "آبادی" پر بحث کرتے ہوتے آبادی کی روز افزوں تعداد کی روک کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہ اس دور کی بات ہے کہ جب مغربین اقتصادیات نے بھی اسے لائق اعتنا خیال نہ کیا تھا۔ اس موضوع پر اوّلیں کتاب پی۔ کے۔ واتل کی مشہور تصنیف "ہندوستان کی آبادی کا مسئلہ" ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی۔ اقبال اس سے پندرہ سولہ سال پیشتر آبادی کی تیز رفتاری کے انسداد پر زور دے چکے تھے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"ہمارے ملک میں سامان معیشت کم ہے اور آبادی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ قدرت قحط اور وبا سے اس کا علاج کرتی ہے۔ مگر ہم کو بھی چاہیئے کہ بچپن کی شادی اور تعددِ ازواج کے دستور کی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں ..... اقتصادی لحاظ سے انسان کی بہبود اسی میں ہے کہ وہ حتی المقدور اپنی حیوانی خواہشوں کو پورا کرنے سے پرہیز کرے اور جہاں تک ممکن ہو بچوں کی کم سے کم تعداد پیدا کرے۔ یہ مطلب بڑی عمر میں شادی کرنے یا بالفاظ دیگر شرح پیدائش کم کرنے اور نفسانی تقاضوں کو بالعموم ضبط کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔" [2]

---

[1] علم الاقتصاد از شیخ محمد اقبال صفحہ ۱۵۲، ۱۵۳

[2] علم الاقتصاد از شیخ محمد اقبال ۲۰۷، ۲۰۸

لیکن یاد رہے کہ اس کے ساتھ اقبال نے محنت و مشقت سے کام لینے کی تلقین کی ہے اور تجدید نسل یا خاندانی منصوبہ بندی کو شریعت کی روشنی میں جانچنے کی دعوت دی ہے :۔

"شریعتِ اسلامی نے اجتماعی مسائل میں صالح امت کو نظر انداز نہیں کیا اور اس کے تصفیے کو اہل علم پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ حالات د

(باقی اگلے صفحہ پر)

25

قومی زندگی کا اہم مسئلہ

اکتوبر ۱۹۰۴ء میں ماہنامہ "مخزن" میں علامہ اقبال کا ایک مضمون "قومی زندگی" کے عنوان سے شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے ملکی اور قومی اصلاح و ترقی کے سلسلہ میں اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے اہلِ ہندوستان کو اس امر پر آمادہ کیا ہے کہ وہ دیگر متمدن اور ترقی یافتہ اقوام سے سبق حاصل کریں:۔

"اگر ہم جاپان کی تاریخ سے فائدہ اٹھانا چاہیں اور موجودہ وقت میں یہی ملک ہمارے واسطے بہترین نمونہ ہے تو اس وقت ہمیں دو چیزوں کی سخت ضرورت ہے یعنی اصلاحِ تمدن اور تعلیم عام"۔ [1]

اس مضمون میں انہوں نے وسیع النظری سے کام لیتے ہوئے انگریزوں، جاپانیوں اور یہودیوں وغیرہ کی ترقیاتی کوششوں کو سراہتے ہوئے اہل وطن کو بھی معاشی ترقی کی ضرورت کا احساس دلایا ہے اور محنت کش طبقے کو اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:۔

"میں صنعت و حرفت کو قوم کی سب سے بڑی ضرورت خیال کرتا ہوں اور اگر میرے دل کی پوچھو تو سچ کہتا ہوں کہ میری نگاہ اس بڑھئی کے ہاتھ جو شیشے کے متواتر استعمال سے کھردرے ہو گئے ہیں ان نرم نرم ہاتھوں کی نسبت بدرجہا خوبصورت اور اور مفید ہیں جنہوں نے قلم کے سوا کسی اور چیز کا بوجھ کبھی محسوس نہیں کیا"۔ [2]

(حاشیہ پچھلے صفحہ سے آگے)

مقتضائے وقت کے مطابق ان کا فیصلہ کریں۔ اس لئے اگر خط نفس مقصود نہ ہو حقیقی ضرورت موجود ہو اور فریقین رضامند ہوں تو جہانتک میرا علم رہنمائی کرتا ہے شرعاً ضبط تولید قابل اعتراض نہیں ہے۔ اصول شرعی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خاوند اپنی بیوی کو اگر وہ اولاد کی خواہشمند نہ ہو اولاد پیدا کرنے پر باکراہ مجبور نہیں کر سکتا۔ لیکن دنیا میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے اس کا بیشتر حصہ حظِ نفس پر مبنی ہے اور محض حظِ نفس کے لئے ایسا کرنا میرے نزدیک حرمت کے درجے تک پہنچتا ہے..... شرعی پہلو سے جو میں نے رائے دی ہے وہ ماہر شریعت کی حیثیت سے نہیں دی محض اپنے علم و مطالعہ کی بنا پر دی ہے"۔ (رسالہ الحکیم لاہور نومبر ۱۹۳۶ء اور رسالہ ہمدرد صحت دہلی جولائی ۱۹۳۹ء)

اس سلسلہ میں علامہ اقبال کے فارسی کلام کے مجموعے کا وہ حصہ بھی لائق مطالعہ ہے جس میں انہوں نے مریخ کی نبیہ کی دعوت کا ذکر کیا ہے اس عورت نے عورتوں کو اولاد پیدا کرنے اور اس کی پرورش کرنے سے روکا ہے اور اس طرح مغربی عورت کی خود غرضی، نفس پرستی اور غیر فطری تصورِ مساوات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ (جاوید نامہ ۱۲۷ - ۱۲۹)

[1] قومی زندگی اور ملتِ بیضا پر ایک نظر از اقبال صفحہ ۴۰

[2] ایضاً صفحہ ۵۵، ۵۶

سودیشی تحریک کے معاشی پہلو

جس زمانے میں اقبال یورپ میں حصولِ تعلیم کی غرض سے مقیم تھے ہندوستان میں تحریک آزادی کی مہم شروع ہو چکی تھی۔ اسی دور میں "سودیشی تحریک" کا آغاز ہوا جس نے ملکی اشیاء کے استعمال پر زور دیا اور اس طرح غیر ملکی اشیاء کے خلاف سیاسی جنگ میں اہلِ ہند کی رہنمائی کی۔ اس تحریک کو متعارف کرانے میں مولانا حسرت موہانی کے "اُردوئے معلیٰ" اور پنڈت دیا نرائن نگم کے رسالہ "زمانہ" نے ناقابلِ فراموش خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۰۶ء میں مدیرِ "زمانہ" نے ممتاز مسلم رہنماؤں کے نام اس تحریک کے بارے میں سوالنامہ جاری کیا۔ اس کے جواب میں مارچ، اپریل میں حالی، شبلی، ذکاء اللہ اور خواجہ غلام الثقلین اور مئی میں سر عبدالقادر کے لندن اور پروفیسر شیخ محمد اقبال کے کیمبرج سے ارسال کردہ خطوط "سودیشی تحریک اور رہبرانِ اسلام" کے زیرِ عنوان شائع ہوئے۔ علامہ نے ایک ماہر معاشیات اور سیاسیات کی حیثیت سے اہلِ وطن کو جذبات کی رو میں بہہ کر وسائل پیدا کئے بغیر بدیسی مال کا بائیکاٹ کرنا معاشی خودکشی کے مترادف قرار دیا لیکن حب وطن، اتحاد و اتفاق صبر و استقلال کی موجودگی میں اسے مفید قرار دیا۔ کیونکہ اقتصادی حالات کی درستی کے بغیر سیاسی حقوق حاصل نہیں کئے جا سکتے لہٰذا اس مسئلہ کی طرف اہلِ ملک کو خاص توجہ دینی چاہیئے۔ [1]

اسی دوران انہوں نے محسوس کیا کہ وہ فلسفہ و شعر کی طرف ضرورت سے زیادہ توجہ دے رہے ہیں تو اس میں توازن پیدا کرنے کے لئے کیمبرج میں علم معاشیات سے دلچسپی لینی شروع کر دی۔ ظاہر ہے کہ ان کا اصل میدان فلسفہ، شعر و ادب، قانون اور سیاسیات کے مضامین پر مشتمل تھا لہٰذا وہ زندگی کے معاشی پہلو کی اصلاح، ترتیب، تنظیم وغیرہ پر بہت زیادہ توجہ نہ دے سکے تاہم اس کی طرف سے وہ کبھی غافل بھی نہ ہوئے۔ ممتاز حسن صاحب رقمطراز ہیں:۔

"خود اقبال نے مجھ سے بیان کیا کہ کیمبرج کے زمانے میں انہیں وقتاً فوقتاً یہ احساس ہوتا تھا کہ فلسفے میں ان کا انہماک ضرورت سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔ چنانچہ اس احساس کے پیشِ نظر وہ کیمبرج کی دانش گاہ میں گاہے گاہے اقتصادیات کے درس میں شریک ہوا کرتے تھے تاکہ اپنی شخصیت میں توازن قائم رکھ سکیں۔" [2]

---

[1] "ایک جوئے کہستاں کی موجِ رواں" از عابد رضا بیدار مندرجہ ماہِ نو کراچی (اقبال نمبر) اپریل ۱۹۷۷ء

[2] علم الاقتصاد از اقبال ـــ پیش لفظ از ممتاز حسن صفحہ ۲

27

اقتصادی اصلاح کی ضرورت

۱۹۱۰ء میں اقبال نے "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے عنوان سے ایک معرکہ آرا خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس میں انہوں نے مسلمان ہندوستانی باشندوں کی اصلاح احوال کے لئے گراں قدر مشورے دیئے۔ ایک مقام پر قومی اصلاح کے لئے اقتصادی اصلاح پر اس طرح زور دیتے ہیں :-

"سب سے زیادہ اہم عقدہ اس مسلمان کے سامنے جو قومی کام کے لئے اپنے آپ کو وقف کرنا چاہتا ہے یہ ہے کہ کیونکر اپنی قوم کی اقتصادی حالت کو سدھارے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ ہندوستان کی عام اقتصادی حالت پر نظر غائر ڈال کر ان اسباب کا پتہ لگائے جنہوں نے ملک کی یہ حالت کر دی ہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ کسی اور مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے یہ دریافت کرے کہ ملک کی حالت میں کس حد تک ان بڑی بڑی اقتصادی قوتوں نے حصہ لیا ہے جو آج کل کی دنیا میں اپنا عمل کر رہی ہیں کس حد تک اہل ملک کی تاریخی روایات، عادات، اوہام اور اخلاقی کمزوریوں نے حصہ لیا اور اگر گورنمنٹ کے طرز عمل کا بھی اس میں کوئی حصہ ہے تو وہ کس حد تک ہے شرح مال گزاری میں آئے دن کا اضافہ مسکرات ممالک غیر کی اس ملک میں درآمد، قیمت اجناس کی گرانی کا باعث ممکن ہے۔ یہ ہو کہ سکہ رائج الوقت کے متعلق حکومت کے قائم کئے ہوئے اصول غلط ہیں یا یہ کہ ایک زراعتی ملک اور ایک صنعتی ملک کے درمیان آزاد تجارت کا سلسلہ قائم کر دیا گیا یا کوئی اور سبب ہو۔" [1]

---

[1] قومی زندگی اور ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر از اقبال

اقبال یورپ میں

معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے معاشی مسئلہ نے اقبال کو شروع ہی سے بے چین کئے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ سفر یورپ میں بھی انہوں نے اس پر حتی الامکان غور و خوض کیا اور تقریباً یہی وہ دور ہے جس میں یورپ صنعتی و تجارتی ترقی کی شاہراہ پر انتہائی تیز رفتاری سے رواں دواں تھا۔ اقبال اس سے اس حد تک متاثر ہوئے کہ انہوں نے شعر و شاعری کو ایک بیکار شغل خیال کرتے ہوئے ترک کر دیا لیکن جلد ہی وہ اس ترقی کے تاریک اور مہلک پہلوؤں سے آگاہ ہو گئے آگے بڑھنے سے پیشتر ضروری ہے کہ یورپ کے معاشی انقلاب اور صنعتی و تجارتی ترقی کے پس منظر سے واقفیت حاصل کی جائے۔ جس سے اقبال کے مخصوص ذہنی رویے کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

یورپ کے معاشی انقلابات

پانچویں صدی عیسوی میں رومن سلطنت کے زوال سے جاگیرداری کا آغاز ہوا۔ اس نظام کے تحت اقتدار کی اصل بنیاد جاگیرداری قرار پائی۔ اس سے ایک طرف تو صنعت و تجارت اور علم و فن کی نشوونما رک گئی دوسری طرف پیشوں کی بنیاد پر برادری سسٹم کو استحکام حاصل ہوا جو بذات خود صنعتی ترقی کے لئے نقصان دہ تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ عیسائیوں کے مذہبی پیشواؤں نے اس ظالمانہ اور جابرانہ نظام کا تحفظ اپنا فریضہ خیال کیا۔ کیونکہ اس طرح انہیں بہت زیادہ مادی فوائد مل سکتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد مسلمانوں نے اندلس اور صقلیہ پر قبضہ کر لیا اور آہستہ آہستہ یہ علاقے تہذیب و تمدن کے اعلیٰ ترین مرکز بن گئے جن سے یورپ کی ابھرتی ہوئی اقوام نے بھرپور استفادہ کیا۔ جس کے نتیجے میں یورپ میں پہلی مرتبہ علم و فن کو فروغ حاصل ہوا اور چودھویں سے لے کر سولہویں صدی تک کا زمانہ دور متوسط کہلاتا ہے جس میں مغربی ممالک کی ترقی کا سلسلہ شروع ہوا۔ پریس کی ایجاد ہوئی، علوم و فنون کی بڑے پیمانے پر اشاعت اور تدریس کی طرف توجہ مبذول ہوئی، نئی نئی جغرافیائی دریافتیں ہوئیں جس سے وسیع پیمانے پر تجارت کا آغاز ہوا اور تاجر پیشہ طبقہ نے بتدریج جاگیرداری اور اس کے مذہبی محافظ کلیسائی نظام کی مخالفت کا زبردست مقابلہ کیا۔ نتیجتاً سولہویں صدی تک پہنچتے پہنچتے جاگیرداری نظام بڑی بڑی قومی ریاستوں

29

میں مدغم ہونے لگا اور بورژوا طبقہ نے قدیم استبدادی نظام کی زنجیریں توڑ ڈالیں۔ اس ہمت کامیابی سے عام انسان نے یہ سمجھا کہ اب وہ امن چین سے زندگی بسر کر سکے گا لیکن ہوا یہ کہ مغربی معاشرہ مکمل طور پر مادیت کی لپیٹ میں آگیا۔ سیاست کا رشتہ اخلاق سے کٹ گیا، انفرادیت پسندی اپنی انتہائی اور ظالمانہ شکل میں ظاہر ہونے لگی۔ دوسرے انسانوں کے حقوق کی قیمت پر اپنی غرض اور مفاد کا تحفظ مقصد زندگی قرار پایا اور تجارتی معاملات میں سودی کاروبار کے رواج سے معاشرے کے پورے جسم سے خون سمٹ کر چند مخصوص حصوں میں ذخیرہ ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی سرمایہ دار طبقہ نے اپنے روز افزوں غلبہ کے دوام اور اپنے اقتدار کے تحفظ اور استحکام کے لئے یہ نقطہ نظر اختیار کیا کہ چرچ، ریاست اور معاشرہ کو کسی بھی فرد کے معاشی مفاد اور ترقی میں رکاوٹ ڈالنے کا حق نہیں۔ اسے آزاد خیالی کی تحریک (LIBERALISM) کا خوبصورت نام دیا گیا۔ جدید سرمایہ دارانہ نظام کے قیام اور آزاد خیالی کی تحریک نے مغربی معاشرے میں بے قید معاشی نظام کو فروغ دیا جس کی رُو سے شخصی ملکیت انسان کا فطری حق قرار پائی، جس پر کسی قسم کی پابندی خلاف فطرت قرار دی گئی اور یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ مقابلہ اور مسابقت کے فطری اصول کے مطابق سرمایہ و محنت کے حقوق و فرائض میں توازن پیدا ہوتا چلا جائے گا وغیرہ۔ اس زاویہ نگاہ میں قدرے صداقت بھی کارفرما تھی، لیکن اکثر و بیشتر خود غرضی اور انتہا پسندی کا غلبہ تھا۔ اور بہت جلد اس کے نقائص نمایاں ہونے لگے، مشینی طریق پیداوار اور بے قید صنعتی و تجارتی ترقی سے بیروزگاری بڑھ گئی۔ محنت کی قیمت بہت زیادہ گر گئی جس سے مزدوروں نے انجمنوں کی صورت میں منظم ہونا شروع کر دیا۔ لیکن سرمایہ دار اور تاجر طبقہ کے پاؤں مغربی معاشرے میں بہت زیادہ مضبوط تھے۔ وقت کا فلسفہ اور ریاست اس کے پشت پناہ تھے۔ حکومت ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئی، انہوں نے خریدار، محنت کش طبقہ اور حکومت کے خلاف مضبوط جتھہ بندی کر لی۔ اسی طبقہ نے وطن پرستی اور قومیت پرستی کے جدید تصور کو ابھارا، تاکہ اس کے معاشی مفادات محفوظ رہ سکیں۔ اس طرح انہوں نے مغربی معاشرے کی مادیت اور جاگیرداری وغیرہ کے خلاف عوام کے زبردست ردعمل کو اپنے مفادات کے لئے خوب خوب استعمال کیا۔ دُنیا اور دین کی جدائی کے تصور نے سرمایہ دار طبقہ کو معاشی لوٹ مار کے لئے کھلا چھوڑ دیا۔ انہوں نے ذاتی مفاد کے لئے اجتماعی مفادات بھینٹ چڑھا دیئے۔ ذخیرہ اندوزی، ایجنسی سسٹم، قیمتوں میں کمی کے ڈر سے پیداوار کا ضیاع، سامان تعیش کی فراوانی، مضر صحت، مخرب اخلاق اشیا کی تیاری، استعمار پسندی، سود خوری وغیرہ لاتعداد برائیاں اس نظام کے پیٹ میں پرورش پانے لگیں جنہوں نے پوری دنیا کو جہنم میں تبدیل کر دیا۔ بورژوا طبقہ کے جاگیرداروں کی طرح بلکہ ان سے بڑھ کر ظلم و ستم سے متاثر ہونے والے عوام اور ان کے فکری رہنماؤں نے فکر و نظر کا توازن کھو دیا اور اصل خرابیوں کی بجائے ان فطری قوانین پر ہی ہلہ بول دیا جن پر ابتدائے آفرینش سے انسانی تمدن و معیشت کی تعمیر ہوتی چلی آرہی تھی۔ انہوں نے یہ قرار دیا کہ خرابی کی اصل جڑ سرمایہ کا غلط استعمال

نہیں بلکہ شخصی ملکیت کا تصور ہے۔ جس نے بڑی بڑی اجارہ داریوں کو قائم کرکے عوام کی اکثریت کو معاشی محتاجی میں مبتلا کر دیا اور اس سلسلہ میں عیسائیت نے ملوکیت اور جاگیرداری کے بعد سرمایہ دارانہ نظام کو تحفظ دیا لہٰذا مذہب اور مذہبی رہنما اس معاشی ظلم کے مددگار قرار دیئے گئے۔ نیز چونکہ انسان ماحول کی پیداوار ہے اس لئے اس کی اصلاح کے لئے تمام ذرائع پیداوار قومی ملکیت میں لے لئے جائیں اور اس منزل تک پہنچنے کے لئے طبقاتی نزاع ناگزیر ہے۔ صرف قومی ملکیت کی صورت ہی میں بڑی بڑی اجارہ داریوں کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ محنت اور سرمائے کی مؤثر اور مفید منصوبہ بندی کی جا سکتی ہے، بیروزگاری کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے اور ہر فرد بشر کو بنیادی ضروریات زندگی سے مستفید کیا جا سکتا ہے۔ اقبال نے قیام یورپ کے دوران مغرب کے ان فکری و عملی انقلابات کا گہری نظر سے مطالعہ و مشاہدہ کیا۔ کیونکہ اسی دور میں پورا یورپ معاشی تبدیلیوں اور ان کے نتائج پر بحث مباحثے میں مصروف تھا۔ اقبال نے مغربی معاشرے کے معاشی پہلو کی خرابیوں کو شدت سے محسوس کیا۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم اوّل سے فائدہ اٹھا کر روس کی اشتراکی پارٹی نے اکتوبر ۱۹۱۷ء میں لینن کی قیادت میں انقلاب برپا کر دیا اور اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد شروع کر دی۔ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کی تباہ کاریوں اور ہلاکت خیزیوں سے تنگ آنے والی انسانیت نے اشتراکی انقلاب کو امن و انصاف کے سورج کے طلوع کے مترادف قرار دیا۔ دنیا بھر کے اہل فکر و نظر لوگوں نے اپنی توجہ روس کی طرف مبذول کر دی اور مغربی استعماریت اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف صف آرا تحریکوں کو اس سے بے حد تقویت ملی۔ مغربی سامراج نے سمٹنا شروع کر دیا۔ اور اپنے ملکوں میں معاشی اصلاح کے پروگرام نافذ کرنے پر آمادہ ہونے لگا۔ ہندوستان میں بھی حریت پسند اور آزادی خواہ رہنماؤں اور جماعتوں کو اس انقلاب کی طرف توجہ دینی پڑی۔ چونکہ علامہ اقبال کو شروع ہی سے معاشی و اقتصادی اصلاح کے موضوع سے دلچسپی رہی تھی اور وہ مغربی سرمایہ دارانہ نظام کی ہلاکت خیزیوں سے آگاہ تھے۔ اس لئے انہوں نے اشتراکی انقلاب کی پذیرائی اس بنا پر کی کہ اس طرح کمزور قوموں اور دنیا کے پس ماندہ طبقوں کے ابھرنے کا امکان پیدا ہو رہا تھا۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کسی طرح درست نہیں کہ اگر انقلاب روس برپا نہ ہوتا تو اقبال معاشی مسئلہ کی اہمیت سے پوری طرح واقف نہ ہوتے جیسا کہ پروفیسر محمد عثمان نے "اقبال اور روس" کے زیر عنوان مضمون میں اقبال کی اوّلیں تصنیف "علم الاقتصاد" اور ان کی معاشیات سے گہری اور مسلسل دلچسپی کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کا شرح صدر روسی انقلاب کا مرہون منت ہے۔ اگر یہ انقلاب برپا نہ ہوتا تو ان کے معاشی شعور میں گہرائی پیدا نہ ہوتی۔ قرآن مجید کی آیت "یسئلونک ماذا ینفقون ط قل العفو" نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"اقبال نے اس آیہ شریفہ سے متعدد بار استدلال کیا ہے لیکن ان کی توجہ اس آیہ شریفہ کی طرف اور اس کے

مضمرات کی طرف انقلاب روس کے بعد ہوئی۔ ان کے پہلے کلام میں اس قسم کے استدلال کا کہیں پتہ نہیں۔"

(صفحہ ۱۶۶)

پھر کہتے ہیں" پیام مشرق سے لیکر ارمغان حجاز تک اپنی چھ سات کتابوں میں اقبال نے سرمایہ دار اور مزدور، سامراج اور محکوم کے بارے میں مختلف طریق اور پیرائے میں جو کچھ کہا ہے وہ سب انقلاب روس کے بعد کہا ہے۔" (صفحہ ۱۶۵)

اسی طرح ایک اور جگہ اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں :۔

"اوّل ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کا اقبال نے ایک خاص جوش وخروش اور شاعرانہ خلوص کے ساتھ خیر مقدم کیا تھا۔ دوم اس انقلاب کے بعد سے اور شاید اس کی بدولت اقبال کے معاشی شعور میں مزید گہرائی اور نظر پیدا ہوئی اور انہوں نے بندۂ مزدور کے تلخ اوقات اور سرمایہ ومحنت کی آویزش پر کھل کر اور زیادہ صحت کے ساتھ لکھا۔ سوم کارل مارکس، لینن اور اشتراکی تحریک کے بارے میں اقبال نے ایک منفرد انداز نظر اختیار کیا جو ہمدردی اور اختلاف کا بے مثل امتزاج تھا۔ چہارم عالم اسلام اور روس کے جغرافیائی قرب وتعلق کی بنا اقبال کا ذہن بار بار روس کی طرف جاتا رہا اور مستقبل کے ہر خاکے میں انہوں نے اسلامی دنیا بالخصوص اسلامی ہند اور روس کے باہمی تعلق کو ملحوظ و مدنظر رکھا اور پنجم یہ کہ روس اور اشتراکیت کی طرف جاتا اقبال کا نقطہ نظر پاکستان کا نہایت قیمتی ورثہ ہے جس سے فیض اور فائدہ نہ اٹھانا ہماری بہت بڑی محرومی اور غلطی ہوگی۔"

(حیات اقبال کا ایک جذباتی دور، صفحہ ۱۵۹)

اس سے تین نتیجے نکلتے ہیں۔ (۱) اقبال نے صرف ۱۹۰۳ء میں یا پھر ۱۹۱۷ء کے بعد معاشی مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے جب کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اقبال نے زندگی کے ہر دور میں اس مسئلہ پر غور وخوض اور اظہار خیال کیا۔ (۲) مذکورہ آیت کے معنی اب تک غیر واضح تھے یا نعوذ باللہ رسول اللہؐ اور خلفائے راشدین بھی انقلاب روس کا مطالعہ ومشاہدہ نہ کر سکنے کی بنا پر اس کے حقیقی معنی سے لاعلم تھے (۳) اقبال کے سفر یورپ، مغربی فلسفے، مشرقی اور دینی علوم، قرآن مجید کے مطالعہ اور ہندوستان کی سیاسی وسماجی تحریکوں کے مشاہدہ سے تو ان پر معاشی مسئلہ کی اہمیت واضح نہ ہو سکی لیکن ادھر انقلاب روس برپا ہوا اور ادھر یکایک ان کے معاشی شعور کو گہرائی نصیب ہوئی۔ اسی لئے وہ اشتراکی انقلاب کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ یہ اس شخص کے بارے میں کہا جا رہا ہے جس نے دین اسلام کو ہر قسم کی جدت وترقی پسندی کا سرچشمہ قرار دیتے ہوئے مرد مومن کو تلقین کی ہے۔

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے افلاک منور ہوں ترے نور سحر سے

اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی کیا تجھ میں نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی 32

(ضرب کلیم صفحہ ۱۲۰-۱۲۱)

یہ درست ہے کہ اقبال نے مغرب کے سامراجی اور استحصالی نظام سرمایہ داری کے قلع قمع کے لئے اشتراکی نظام کی تعریف کی ہے لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے اس نظام کو اندھا دھند اپنانے کی تلقین بھی کی ہے۔ جو لوگ دیانتداری سے اقبال کے اس نقطہ نظر کو سمجھتے ہیں اور ان کی شاعرانہ مقبولیت کو مارکس و لینن کی اشتراکیت کے لیے شمشیر بے نیام تصور کرتے ہیں۔ وہ اس کے برعکس یہ پیرایہ بیان اختیار کرتے ہیں کہ اقبال تو رومانویت اور جذباتیت کا شکار تھے وہ کوئی حقیقت پسند مفکر نہ تھے۔ لہٰذا وہ عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل کا حل پیش کرنے سے قاصر ہیں اور اس مقصد کے لئے اسلامی ضابطہ حیات کو پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سید علی عباس جلال پوری ایسے دانشور قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون "اقبال کے رومانی افکار" مندرجہ ماہنامہ "ادبی دنیا" لاہور (دور پنجم شمارہ ہفتم) میں اقبال کے افکار کا سرچشمہ مغرب کی رومانی تحریک کو قرار دیا ہے۔ جو سیاسیات میں استبداد، عمران میں فردیت، فلسفے میں خرد دشمنی، ادبیات میں جذباتیت اور اخلاق میں انانیت کی پرورش کرتی ہے۔ خود مرکزیت اور ماضی پرستی اس کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ رومانی بالعموم سیاسی اور اقتصادی عقدوں کو حقیقت پسندی کے نقطہ نظر سے سلجھانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ آخر میں کہتے ہیں "اقبال کے رومانی افکار کا جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ رومانی طبع ہونے کے باعث ان تنوع اور پیچیدہ سیاسی، اقتصادی، عمرانی اور علمی عقدوں کا کوئی واضح حل پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں جو آج مسلمانان عالم کو درپیش ہیں"۔ (صفحہ ۲۹)

مصنف نے افکار اقبال کے ساتھ سب سے بڑی زیادتی یہ کی ہے کہ انہیں مغربی رومانی تحریک کے چوکھٹے میں فٹ کر دیا ہے اور چونکہ اقبال نے مغربی نظریات کو اندھا دھند قبول نہیں کیا بلکہ اسلام کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے وہ ماضی پرست قرار دیئے گئے ہیں۔ یہاں یہ موقع نہیں کہ مصنف کی تحریفات کو پیش کیا جائے۔ البتہ چند باتیں ضرور عرض کرنا ہیں۔ (۱) بے شک وہ اپنے دور کے مخصوص معاشی و سماجی نظام سے نالاں تھے۔ (۲) وہ مغرب کے پیش کردہ کسی نظام یا نظریئے کو من و عن قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ (۳) وہ ایسا معاشرہ چاہتے تھے جس میں انفرادیت اور اجتماعیت کا حسین امتزاج ہو اس سلسلہ میں "اسرار و رموز" کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے جس کی طرف علی عباس صاحب نے مطلق توجہ نہیں دی۔ (۴) وہ ماضی پرستی کے جمود کا شکار نہ تھے بلکہ اسلام کے ابدی اور اٹل اصولوں کے دائرے میں رہ کر اجتہاد کے قائل تھے۔ ان کے "خطبات مدراس" اس کی واضح دلیل ہیں۔ (۵) مارکس وغیرہ اگر انسانیت کے ابتدائی دور کے فطری طرز معیشت

33

معاشرت کی طرف رجوع کریں اور اسے دوبارہ لانا چاہیں تو ترقی پسند اور انقلابی کہلائیں۔ اقبال اگر اسلامی نظام عدل کو موجودہ خرابیوں کا واحد حل قرار دیں تو رجعت پسند، ماضی پرست اور احیائیت کے علمبردار قرار پائیں۔ (۶) اقبال خرد دشمن نہیں بلکہ وہ خرد اور جذبہ کو وحی ربانی کی رہنمائی میں آگے بڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ (۷) رہی یہ بات کہ انہوں نے موجودہ دور کے مسائل کا حل پیش نہیں کیا گویا انہوں نے اسلام کی انقلابی تعلیمات کی طرف جو توجہ دلائی ہے وہ کوئی حل نہیں ہے (۸) جس طرح اقبال کو رومانی ثابت کیا جا سکتا ہے اسی طرح اینجلز، کارل مارکس، لینن بلکہ ہر بڑے شخص کو رومانی تحریک کی پیداوار قرار دیا جا سکتا ہے۔

"بانگِ درا" اور معاشی مسئلہ

۱۹۲۴ء میں علامہ اقبال کا پہلا اردو مجموعہ کلام "بانگِ درا" کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں اقبال کا وہ تمام کلام شامل ہے جو ۱۹۲۴ء تک کہا گیا تھا۔ اس کا ایک حصہ "ظریفانہ" ہے جس میں اکبر کے رنگ کی نظمیں اور قطعے وغیرہ ہیں۔ یہ کلام بہت پہلے کا ہے اس میں دو تین مقامات پر اقبال نے معاشی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔

رات مچھر نے کہہ دیا مجھ سے ماجرا اپنی ناتمامی کا
مجھ کو دیتے ہیں ایک بوند لہو صلہ شب بھر کی تشنہ کامی کا

اور یہ بسوہ دار بے زحمت
پی گیا لہو سب اسامی کا۔ (بانگ درا: ۳۳۳)

جان جائے ہاتھ سے جائے نہ نست ہے یہی اک بات ہر مذہب کا تت
چٹے بٹے ایک ہی تھیلی کے ہیں ساہوکاری، بسوہ داری، سلطنت (بانگِ درا: ۳۳۳)

محنت و سرمایہ کی صف آرائی کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:۔

محنت و سرمایہ دُنیا میں صف آرا ہو گئے دیکھئے ہوتا ہے کس کس کی تمناؤں کا خُون
حکمت و تدبیر سے یہ فتنہ آشوب خیز ٹل نہیں سکتا "وقد کنتم بہ تستعجلون"
"کھل گئے" یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام
چشم مسلم دیکھ لے تفسیر حرف "ینسلون" (بانگِ درا: ۳۳۴)

اس دور میں اقبال کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ زمین اس کی ہے جو کاشت کرے۔

تکرار تھی مزارع و مالک میں ایک روز دونوں یہ کہہ رہے تھے مرا مال ہے زمیں

کہتا تھا وہ کرے جو زراعت اسی کا کھیت　　کہتا تھا یہ کہ عقل ٹھکانے تیری نہیں

پوچھا زمیں سے میں نے کہ ہے کس کا مال تو　　بولی مجھے تو ہے فقط اس بات کا یقیں

مالک ہے یا مزارع شوریدہ حال ہے

جو زیرِ آسماں ہے وہ دھرتی کا مال ہے　　(بانگِ درا: ۳۳۴، ۳۳۵)

یہاں بظاہر یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اقبال انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کرتے ہیں حالانکہ بعد میں انہوں نے واضح کر دیا کہ زمین اور وسائل رزق کا مالک نہ فرد ہے اور نہ جماعت بلکہ صرف اللہ ہے فرد اور قوم اس کے محض امین ہیں۔

بہرحال اسی دور کے ایک قطعے کا ایک شعر ملاحظہ ہو جو "باقیاتِ اقبال" کے ظریفانہ حصہ میں درج ہے:۔

خدا کی زمین تھی مزارع نے جوتی　　کمائی مگر چودھری جی نے کھائی [1]

ایک اور قطعے میں وہ سرمایہ دارانہ استحصالی ہتھکنڈوں کے خلاف بھی آواز اٹھاتے ہیں

کارخانے کا ہے مالک مردِ ناکردہ کار　　عیش کا پتلا ہے محنت ہے اسے ناسازگار

حکم حق ہے لیس للانسان الا ما سعیٰ　　کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

(بانگِ درا: ۳۳۵)

انہیں اس بات کا بہت رنج تھا کہ مزدوروں کو سر چھپانے کے لئے جگہ تک میسر نہیں جبکہ سرمایہ داروں کے لئے حکومت عوام کے خرچ پر کونسل ہال تعمیر کرواتی ہے:

سنا ہے میں نے کل یہ گفتگو تھی کارخانے میں　　پرانے جھونپڑوں میں ہے ٹھکانہ دستکاروں کا

مگر سرکار نے کیا خوب کونسل ہال بنوایا　　کوئی اس شہر میں تکیہ نہ تھا سرمایہ داروں کا

(بانگِ درا: ۳۳۶)

"خضرِ راہ" کا مزدور کو پیغام

"بانگِ درا" میں اقبال کی ایک بلند پایہ نظم "خضرِ راہ" ہے جو انہوں نے انجمن حمایت اسلام کے ۳۷ ویں سالانہ اجلاس منعقدہ اپریل ۱۹۲۲ء میں پڑھی۔ اس میں شاعر (اقبال) خضر سے بین الاقوامی حالات و مسائل میں رہنمائی کا خواستگار ہے۔ وہ اس سے زندگی کی حقیقت، سلطنت کی اصلیت، دنیائے اسلام کی بیداری اور سرمایہ و محنت کی آویزش

---

[1] باقیاتِ اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی و محمد عبداللہ قریشی صفحہ ۴۶۲

35

کے بارے میں سوال کرتا ہے۔

ع اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش ؟ (بانگِ درا : ۲۹۰)

اس پر خضر نے "سرمایہ و محنت" کے سلسلہ میں جو اظہارِ خیال کیا ہے وہ نظم کے ساتویں اور آٹھویں بند میں درج ہے اس طرح انہوں نے یورپی استعماری طاقتوں کو خبردار کیا کہ ملوکیت اور نوآبادیاتی طاقتوں کا خاتمہ قریب ہے اور عام آدمی خواب گراں سے بیدار ہو رہا ہے۔ لہٰذا اہلِ مغرب کی بہتری اسی میں ہے کہ اپنی استحصالی عادتوں کو تبدیل کر لیں۔ خضر مزدور کو پیغام بیداری دیتا ہے :۔

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزدیاں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات (بانگِ درا : ۲۹۷)

لیکن ساتھ ہی محنت کش طبقے کی نادانی کا شکوہ بھی کرتا ہے :۔

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
"خواجگی" نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سُکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

(بانگِ درا : ۲۹۸)

لہٰذا محنت کش طبقے کو خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر سرمایہ داری کے تسلط سے نجات حاصل کرنی چاہیئے :۔

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے ! بانگِ درا : ۲۹۸)

3E

تجھے ہمتِ عالی سے کام لینا چاہیئے، سکندر و جم کے خواب آور افسانوں کو چھوڑ کر نغمہ بیداری جمہور میں لگن ہو کیونکہ :-

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک!
توڑ ڈالیں فطرت انسان نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک! (بانگِ درا : ۲۹۹)

کسی ذہنی تحفظ کے بغیر کہنا چاہیئے کہ اقبال سرمایہ و محنت کی تازہ آویزش مفید خیال کرتے تھے اور ان کے خیال میں اشتراکی انقلاب دنیا میں جنت کا نقشہ قائم کرنے میں کوشاں ہے اور اس طرح عالم انسانیت کے رنج و غم اور محرومی و ناکامی کی طویل رات ختم ہونے والی ہے۔ دراصل روس میں اشتراکی انقلاب کی کامیابی سے دُنیا کا ہر وہ شخص مسرور اور پُر امید تھا جو سرمایہ داری، جاگیرداری اور ملوکیت کی زد میں آکر پسنے والے انسانوں کی فلاح و بہبود کا خواہشمند تھا اور اقبال کو چونکہ انسان کے معاشی مسئلہ سے شروع ہی سے دلچسپی تھی اس لئے قدرتی طور پر انہیں روسی انقلاب میں اپنی دیرینہ آرزوؤں کی تکمیل کے امکانات نظر آئے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ جوں جوں روسی انقلاب کی تفصیلات موصول ہوتی گئیں اقبال اس سے بھی اسی طرح نفور ہوتے گئے جس طرح وہ سرمایہ داری وغیرہ سے تھے۔

"پیامِ مشرق" میں معاشی مسئلہ

۱۹۲۳ء میں اقبال نے اپنا فارسی مجموعہ کلام "پیامِ مشرق" (در جواب دیوان شاعر اطالوی گوئٹے) شائع کیا۔ اس کے ایک حصے "نقشِ فرنگ" کی متعدد نظموں میں اقبال نے انسان کے معاشی مسئلہ پر سرمایہ داری کے خلاف محنت کش طبقے نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے۔ پیام، صحبتِ رفتگان (در عالم بالا) محاورہ مابین حکیم آگسٹس کومٹ و مزدور، موسولینن و قیصر ولیم، قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور، نوائے مزدور ایسی نظموں میں بتایا گیا ہے کہ سرمایہ دار طبقہ جن حیلے بہانوں سے اور عیارانہ فلسفوں سے محنت کش طبقے کو ہمیشہ کے لئے غلام رکھنا چاہتا ہے اب ان کا افسوں نہ چل سکے گا کیونکہ محنت کش خوابِ غفلت سے بیدار ہو رہا ہے۔ وہ اپنی نظم "پیام" کے ساتویں بند میں اس طرح انقلاب کی خبر دیتے ہیں۔

37

افسرِ پادشہی رفت و بہ نیمائی رفت
نئے اسکندری و نغمۂ دارائی رفت

کوہکن تیشہ بدست آمد و پرویزی خواست
عشرتِ خواجگی و محنتِ لالائی رفت

یوسفی را نہ اسیری بہ عزیزی بردند
ہمہ افسانہ و افسونِ زلیخائی رفت

رازہائے کہ نہاں بود بہ بازار افتاد!
آں سخن سازی و آں انجمن آرائی رفت

چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است
زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است

(پیامِ مشرق: ۲۳۰، ۲۳۱)

38

حکمائے مغرب کے نظریات

"صحبت رفتگان" (در عالم بالا) درحقیقت جدید دور کے معاشی مسائل پر حکمائے مغرب کا مکالمہ ہے۔ اس میں روس کا مشہور مصلح اور سرمایہ داری کا دشمن ٹالسٹائی، مشہور المانوی اسرائیلی ماہر اقتصادیات کارل مارکس مصنف "سرمایہ" مارکس کا پیشرو ہیگل، مزوک اور کوہکن (مزدور) باہم بحث کرتے ہیں۔ ٹالسٹائی کہتا ہے کہ ملوکیت کا استحکام فوجی طاقت پر موقوف ہے شاہوں کی فوج کا ہر گماشتہ شیطان کا خادم ہے کیونکہ وہ اپنے پیٹ کی خاطر بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت، کلیسا اور وطنیت تینوں بے ہوشی کا الیاد ارو (افیون) ہیں جن کو پلا کر حاکم محکوموں کی جانیں خرید لیتا ہے:۔

بارکش اہرمن لشکری شہریار — از پے نانِ جویں تیغ ستم برکشید
زشت بر چشمش نکوست مغز ندانذ ز پوست — مردک بیگانہ دوست سینۂ خویشاں درید
داروے بیہوشی است تاج، کلیسا، وطن — جان خداداد را خواجہ بجائے خرید

(پیام مشرق: ۲۳۶)

کارل مارکس اس کی تائید میں کہتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں انسان اپنے ہی بھائیوں کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی حقیقت سے ناآشنا ہو کر حیوان بن جاتا ہے۔

رازدان جزو کل از خویش نامحرم شداست
آدم از سرمایہ داری قاتل آدم شداست (پیام مشرق: ۲۳۶)

اس پر ہیگل کہتا ہے کہ کائنات کے ظاہری اختلافات و تضادات روشنی و تاریکی، نرمی و سختی، شیرینی و تلخی وغیرہ ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں اور فطرت نے ان میں کش مکش اس لئے پیدا کر دی ہے تاکہ نظام کائنات جاری رہے۔ لہٰذا سرمایہ دار اور مزدور، اور حاکم و محکوم کی کش مکش بھی فطری ہے۔ گویا ان کا وجود بھی لازمی ہے:۔

39

جلوہ دہر باغ و راغ معنیٔ مستور را عین حقیقت نگر حنظل و انگور را

فطرتِ اضداد خیز لذت سکار را خواجہ و مزدور را آمر و مامور را! (۲۳۷)

یہ سن کر ٹالسٹائی پکار اٹھتا ہے کہ تو اپنا خود پرست فلسفہ اپنے تک محدود رکھ کیونکہ وہ مزدور کو اپنی پسماندگی پر مطمئن رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

عقل دُور و آفرید فلسفۂ خود پرست درس رضا می دہی بندۂ مزدور را؟ (۲۳۷)

پھر مزدک بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہتا ہے کہ (اشتراکیت کا) جو بیج میں نے ایران میں بویا تھا وہ روس اور جرمنی میں پھل پھول رہا ہے۔ سلطانوں اور امیروں کے محلات میں صفِ ماتم بچھ گئی ہے۔ اے مزدور! اب ملوکیت کا دَور ختم ہوا اب اس نعمت گم گشتہ (حاکمیت) کو خسرو (آقا) کے ہاتھ سے چھین لے۔

دانۂ ایراں زکشتِ زار و قیصر بر دمید مرگ نو می رقصد اندر قصر سلطان و امیر

رُوئے در آتش نمرود می سوزد خلیل تا تہی گردد حرعیش از خداوندانِ پیر

دَور پرویزی گذشت اے کشتۂ پرویز خیز نعمت گم گشتۂ خود را ز خسرو باز گیر (۲۳۷)

اس پر کوہکن (مزدور) کہہ اٹھتا ہے کہ سرمایہ دار کی زبان پر تو صلح کے الفاظ ہیں مگر اس کا باطن چنگیز کی طرح خون آشام ہے۔ میں نے اس کی عیاری سے تنگ آکر عقل کا دامن چھوڑ کر جنون کی کیفیت اپنالی ہے اور اپنے ساتھیوں سے فریاد کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ اگرچہ میرے تیشے نے پہاڑ کاٹ کر رکھ دیئے لیکن دنیا میں ابھی تک پرویزیت (ملوکیت) کا دَور دَورہ ہے۔ اے مزدورو! زمین سے لے کر آسمان تک جو کچھ بھی ہے مصروفِ عمل ہے پس باہمی اتحاد و اتفاق سے قدم اٹھاؤ کیونکہ رفتارِ کارواں تیز ہے۔

نگارِ من کہ بسے سادہ و تیز است ستیزہ کش و ستم کوش و فتنہ انگیز است

برون او ہمہ بزم و درون او ہمہ رزم زبان او ز مسیح و دلش ز چنگیز است

گست عقل و جنوں رنگ بست و دیدہ گداخت در آب جلوہ کہ جانم ز شوق لبریز است

اگرچہ تیشۂ من کوہ راز پا آورد!! ہنوز گردش گردوں بکام پرویز است

زخاک تا بہ فلک ہرچہ ہست رہ پیما است
قدم کشائے کہ رفتار کارواں تیز است

(۲۳۸-۲۳۷)

۹۰

آگسٹس کومٹ و مزدور کا مکالمہ

"پیام مشرق" کی ایک اور نظم "محاورہ مابین حکیم فرنسوی آگسٹس و مرد مزدور" ہے۔ کومٹ (یا کونت) جان سٹیوارٹ، ہربرٹ سپنسر اور ڈارون وغیرہ کا معاصر ہے۔ اس کے فلسفہ کو ایجابیت (POSITIVISM) کہتے ہیں جس کی رو سے انسانی تفکر، مذہب اور مابعد الطبیعیات سے گزر کر فطرت محسوس کی طرف آ گیا ہے اور یہ اس کی ترقی کی آخری منزل ہے۔ انسانیت کو اب دیوتاؤں اور ایک خدا اور آخرت کو چھوڑ کر انسانیت کو دین بنانا چاہیئے۔ دنیا میں گزرے ہوئے عظیم الشان انسانوں کی پرستش کے دن مقرر کر لینے چاہئیں۔ تمام نوعِ انسان کو ایک جسم سمجھنا چاہیئے جس طرح جسم انسانی کے ہر عضو کا مخصوص وظیفہ ہے۔ دماغ سوچتا ہے اور پاؤں چلتا ہے۔ اسی طرح معیشت کے کاروبار میں بھی فطری تقسیم کار فرما ہے کوئی حاکم ہے، کوئی محکوم، کوئی مالک ہے اور کوئی اس کا ملازم اور محمود ایسا شہنشاہ ایاز کی طرح غلامی نہیں کر سکتا وغیرہ۔ زندگی میں تقسیم کار ہی کی بدولت راحت پیدا ہوتی ہے۔ گویا انسانی طبقات کی تقسیم فطری ہے۔

"بنی آدم اعضائے یک دیگر اند ہماں نخل را شاخ و برگ و بر اند!!
دماغ از خرد راست از فطرت است اگر پاز میں ساست از فطرت است
یکے کار فرما، یکے کار ساز نیاید ز محمود کار ایاز!!
نہ بینی کہ از قسمتِ کار زیست
سراپا چمن می شود خارِ زیست؟ (۲۴۴)

اس پر مرد مزدور کہتا ہے کہ اے حکیم! تو مجھے اپنے فلسفہ سے فریب دینا چاہتا ہے اور مجھے غلامی کا سبق دے رہا ہے میرے تیشے کی بدولت پہاڑوں سے نہریں رواں ہیں لیکن تو کوہکن کا حق پرویز کو دینا چاہتا ہے۔ سرمایہ دار کا وجود زمین کے کندھوں پر بوجھ ہے وہ کھانے اور سونے کے سوا اور کوئی کام نہیں کرتا۔ پس دنیا کی فارغ البالی اور مسرت کا مکمل انحصار مزدور کی جفاکشی پر ہے۔

فریبی بحکمت مرا اے حکیم کہ نتواں شکست ایں طلسم قدیم
مس خام را از زر اندودہ؟ مرا خوئے تسلیم فرمودہ؟
کند بحر را آبنایم اسیر زخارا برد تیشہ ام جوئے شیر
حق کوہکن دادی اے نکتہ سنج بہ پرویز پُر کار و نا بردہ رنج

خطا را بحکمت مگرداں صواب خضر را نگیری بدام سراب
بدوشش زمین، بار، سرمایہ دار ندارد گذشت از خور و خواب کار
جہاں راست بہرِ دزی از دست مزد ندانی کہ ایں ہیچ کار است دزد
پئے جرم اُو پوزشش آوردہ ؟
بایں عقل و دانشش فسوں خوردہ ؟ (۲۴۴ - ۲۴۵)

موسیولینن و قیصرِ ولیم

"موسیولینن و قیصرِ ولیم" کے عنوان سے ایک نظم میں بانیٔ اشتراکیت لینن، المانوی ملوکیت کے آخری نمائندے قیصر ولیم سے کہتا ہے کہ طویل مدت سے انسان بھاری چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہا ہے۔ ایک طرف وہ ملوکیت کے فریب میں گرفتار ہے اور دوسری طرف کلیسا کے دام میں اسیر ہے، آقا کی قمیص محنت کشوں کے خون سے سرخ ہے، بھوکے غلاموں نے تنگ آ کر آقا کی قمیص کو چاک چاک کر دیا اور عوام کی آگ کے شعلے نے پیرِ کلیسا کی چادر اور سلطان کی قبا کو جلا کر رکھ دیا ہے۔

بسے گذشت کہ آدم دریں سرائے کہن مثالِ دانہ تہِ سنگِ آسیا بود ست
فریبِ زاری و افسونِ قیصری خورد است اسیرِ حلقۂ دامِ کلیسیا بود است
غلامِ گرسنہ دیدی کہ بر درید آخر قمیصِ خواجہ کہ رنگیں زخونِ ما بود ست
شرارِ آتشِ جمہورِ کہنہ ساماں سوخت ردائے پیرِ کلیسیا، قبائے سُلطاں سوخت

(پیامِ مشرق : ۲۴۹)

اس کے جواب میں قیصر ولیم کہتا ہے کہ ملوکیت کا کوئی قصور نہیں دراصل غلامی انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ جب وہ پرانے خداؤں سے بیزار ہوتا ہے تو خود بخود نئے خدا تراش لیتا ہے۔ رہزنوں کے ظلم کی شکایت درست نہیں کیونکہ رہرو خود ہی رہزن ہیں۔ اگر تاجِ شاہی جمہور چھین لیں تو ان کی انجمن بھی ہنگاموں سے خالی نہیں رہے گی۔ انسان کے دل میں اقتدار کی ہوس مٹ نہیں سکتی۔ آتشدان میں ہمیشہ آگ جلتی رہتی ہے۔ عروسِ اقتدار جمہور کو غلام بنانے میں ہمیشہ مصروف رہتی ہے۔ شیریں کے ناز اٹھانے والے ہمیشہ موجود رہتے ہیں، اگر خسرو نہیں تو کوہکن سہی :۔

گناہ عشوہ و ناز بتاں چیست　　طواف اندر سرشت برہمن ہست 42
دمادم نو خداونداں تراشد　　کہ بیزار از خدایان کہن ہست
زجور رہزناں کم گو کہ رہرو　　متاع خویش را خود راہزن ہست
اگر تاج کئی جمہور پوشد　　ہماں ہنگامہ ہا در انجمن ہست
ہوس اندر دل آدم نہ میرد　　ہماں آتش میانِ مرزغن ہست
عروس اقتدارِ سحر فن را　　ہماں پیچاک زلفِ پرُشکن ہست
"نماند از شیریں بے خریدار　　اگر خسرو نباشد کوہکن ہست" (۲۵۰)

قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور

"قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور" ایک طنزیہ نظم ہے جس میں سرمایہ دار مزدور کو اسباب معیشت کی منصفانہ تقسیم کا طریقہ بتاتا ہے تاکہ کسی فریق کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ سرمایہ دار مزدور سے کہتا ہے کہ فولاد کے کارخانوں کا شور وغل میرے اور کلیسا کے سہانے نغمے تیرے، دُنیا کے نخلستان، کھیت اور درخت میرے لیکن باغ بہشت اس کی سدرہ اور طوبیٰ تیری، دردِ سر پیدا کرنے والی شراب میری مگر پاک اور صاف پانی جو آدم و حوا کا مرغوب مشروب ہے تیرا، مرغابیاں، تیتر اور کبوتر میرے لیکن ہما کا سایہ اور عنقا کے پر تیرے، یہ زمین اور اس کے پیٹ میں جو کچھ ہے میرا اور زمین سے لے کر عرش معلیٰ تک سب تیرا۔

غوغائے کارخانۂ آہنگری زمن　　گلبانگ ارغنونِ کلیسا ازانِ من
نخلے کہ شہ خراج بر و می ہنوز من　　باغ بہشت و سدرہ و طوبا ازانِ تو
تلخابہ کہ درد سر آرد ازانِ من　　صہبائے پاک آدم و حوّا ازانِ تو
مرغابی و تدرو و کبوتر ازانِ من　　ظل ہماؤ شہپر عنقا ازان تو
ایں خاک و آنچہ در شکم او ازان من　　از خاک تا بہ عرش معلیٰ ازان تو (۲۵۵، ۲۵۶)

نوائے مزدور

اس کے ساتھ ہی ایک نظم "نوائے مزدور" ہے۔ مزدور کہتا ہے کہ میں خود تو ٹاٹ اور کھدر پہنتا ہوں لیکن میری محنت سے نکما آقا حریر و ریشم کا لباس پہنتا ہے، میں اپنے زور بازو سے کان کھودتا ہوں مگر اس سے نکلے ہوئے لعل حاکم کی انگشتری کا زینت بنتے ہیں، میرے بچوں کے آنسو امیر کے گھوڑے کے ساز کے قیمتی موتی ہیں اور کلیسا کی جونکیں میرا ہی خون چوس چوس کر

کرفربہ ہوئی جاتی ہیں۔ ملوکیت نے بھی میری محنت کی بدولت طاقت وقوت حاصل کی۔ میری آہ وزاری کے سبب ویران اور بنجر زمین رشک گلزار ہے اور میری ہی جفاکشی کے باعث امرا و رؤسا کے چہرے پر ترو تازگی ہے۔

ز مزدِ بندۂ کرپاس پوش و محنت کش — نصیب خواجۂ ناکردہ کار رختِ حریر
ز خوئے فشانئ من لعل خاتمِ والی — ز اشک کودکِ من گوہر ستام امیر
ز خونِ من چو زلو فربہی کلیسا را — بزور بازوئے من دست سلطنت ہمہ گیر
خرابہ رشکِ گلستان ز گریۂ سحرم — شباب لالہ و گل از طراوتِ جگرم (۲۵۷)

گر سنو اے مزدور! ساز کائنات سے نیا نغمہ بلند ہو رہا ہے۔ نظام ملوکیت نزع کے عالم میں ہے۔ آؤ وہ شراب شیشے میں ڈالیں جو اسے پگھلا دے آؤ چمن کے رہزنوں سے انتقام لیں اور ان کا قلع قمع کرکے نئی بزم غنچہ گل کی بنیاد رکھیں۔ تم کب تک پروانوں کی طرح شمع کا طواف کرتے رہو گے اور کب تک اپنی حقیقت سے بیگانہ رہو گے۔

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز — مئے کہ شیشہ گدازد بہ ساغر اندازیم
مغان و دیر مغاں را نظام تازہ دہیم — بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم
ز رہزنان چمن انتقام لالہ کشیم — بہ بزم غنچہ و گل طرح دیگر اندازیم
بطوف شمع چو پروانہ زیستن تا کے
ز خویش ایں ہمہ بیگانہ زیستن تا کے (۲۵۸،۲۵۷)

اقبال کا پسندیدہ معاشی نظام

"پیام مشرق" اور "بانگ درا" کی اشاعت سے کارل مارکس اور لینن کے ہندوستانی مقلدوں نے اقبال کو زبردست اشتراکی، انقلابی اور ترقی پسند سمجھنا شروع کر دیا بلکہ ایک مرحلہ پر جب حکومت برطانیہ نے بعض اشتراکیوں (کامریڈ غلام حسین وغیرہ) پر ہاتھ ڈالا تو اشتراکی روزنامہ "انقلاب" نے اپنے تحفظ (؟) کے لئے علامہ اقبال کو کارل مارکس کے فلسفۂ اشتراکیت کا سب سے بڑا مبلغ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ شمس الدین حسن مدیر "انقلاب" نے ایک مضمون میں لکھا کہ اگر بالشویک خیالات کا حامی ہونا جرم ہے، تو ہمارے ملک کا سب سے بڑا شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال کیوں قانون کی زد سے بچ سکتا ہے کیونکہ بالشویک نظام حکومت کارل مارکس کے فلسفۂ سیاسیات کا لب لباب ہے اور کارل مارکس کے فلسفہ کو عام فہم زبان میں سوشلزم اور کمیونزم کہا جاتا ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی تھوڑی سی عقل کا مالک بھی سر محمد اقبال کی "خضر راہ" اور "پیام مشرق" کو بغور دیکھے تو وہ فوراً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ علامہ اقبال یقیناً ایک اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کے مبلغ اعلیٰ ہیں..... (زمیندار ۲۳ جون ۱۹۲۳ء)۔ اس پر علامہ نے روزنامہ "زمیندار" لاہور کی ۲۴ جون ۱۹۲۳ء کی اشاعت میں ایک خط شائع کرایا جس میں انہوں نے انسان کے معاشی مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں اپنے موقف کو بڑی وضاحت اور صراحت سے اس طرح پیش کیا:

"کسی صاحب نے کسی اخبار میں میری طرف بالشویک خیالات منسوب کئے ہیں چونکہ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے۔ اس واسطے اس تحریر کی تردید میرا فرض ہے۔ میں مسلمان ہوں میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لئے ایک قسم کی لعنت ہے لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے جیسا کہ بالشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لئے قانون میراث و زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز

کیا ہے اور فطرت انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابل عمل بھی ہے۔ روسی بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیشی اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردعمل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے اور جس کا میں نے اُوپر اشارتاً ذکر کیا ہے۔ شریعت حقہ اسلامیہ کا مقصود یہ ہے کہ سرمایہ داری کی بنا پر ایک جماعت دوسری جماعت کو مغلوب نہ کر سکے اور اس مدعا کے حصول کیلئے میرے عقیدے کی رُو سے وہی راہ آسان اور قابل عمل ہے جس کا انکشاف شارع علیہ السلام نے کیا ہے۔ اسلام سرمایہ کی قوت کو معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا بلکہ فطرت انسانی پر ایک عمیق نظر ڈالتے ہوئے اسے قائم رکھتا ہے اور ہمارے لئے ایک ایسا معاشی نظام تجویز کرتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ قوت کبھی اپنے مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے۔ میرا عقیدہ ہے فاصبحتم بنعمتہٖ اخواناً میں اسی نعمت کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ کسی قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں ہو سکتے جب تک وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں اور اس مساوات کا حصول بغیر ایک ایسے سوشل نظام کے ممکن نہیں جس کا مقصود سرمایہ کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق و تولید ہو اور مجھے یقین ہے کہ خود روسی قوم بھی اپنے موجودہ نظام کے نقائص تجربے سے معلوم کر کے کسی ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائے گی جس کے اصول اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے یا ان سے ملتے جلتے ہونگے۔ موجودہ صورت میں روسیلوں کا اقتصادی نصب العین خواہ کیسا ہی محمود کیوں نہ ہو ان کے طریقے عمل سے مسلمان کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کی پولیٹیکل اکانومی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں ان کے لئے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآن کریم کی اقتصادی تعلیم پر نظر غائر ڈالیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام مشکلات کا حل اس کتاب میں پائیں گے۔ لاہور کی لیبر یونین کے مسلمان ممبر بالخصوص اس طرف توجہ کریں مجھے ان کے اغراض و مقاصد کے ساتھ دلی ہمدردی ہے مگر مجھے اُمید ہے کہ وہ کوئی ایسا طرز عمل یا نصب العین اختیار نہ کریں گے جو قرآنی تعلیم کے منافی ہو۔" [1]

---

[1] ۔ گفتارِ اقبال مرتبہ محمد رفیق افضل صفحہ ۶ تا ۸

4E

اس خط سے مندرجہ ذیل نکات اخذ کئے جا سکتے ہیں :-

۱۔ اشتراکی خیالات رکھنے والا مسلمان نہیں رہ سکتا۔

۲۔ اقبال مسلمان ہیں اور قرآنی تعلیمات کو اقتصادی مسائل کا واحد حل تصور کرتے ہیں۔

۳۔ "سرمایہ" ایک ایسی قوت ہے جو بذاتِ خود نہ اچھی ہے نہ بُری۔ البتہ اس کا استعمال اسے اچھا یا بُرا بناتا ہے اشتراکیت اسے غلطی سے تمام خرابیوں کی جڑ خیال کرتی ہے۔

۴۔ قرآن سرمایہ کو مناسب حدود میں رکھنے کے لئے قانون میراث و زکوٰۃ وغیرہ تجویز کرتا ہے۔

۵۔ مغربی سرمایہ داری اور روسی اشتراکیت افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ قرآن کا پیش کردہ نظام ہے جس میں فرد اور جماعت کے درمیان عدل کیا جاتا ہے۔

۶۔ مساوات صرف معاشی نہیں بلکہ ہمہ پہلو ہونی چاہیئے۔

۷۔ اسلام کا عالمِ انسانیت پر سب سے بڑا احسان "اخوت انسانی" کا قیام ہے جس میں مادی امتیازات رنگ، نسل، خون، وطن، زبان، مال اور منصب بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں جس میں ترقی کے مساوی مواقع سب کو حاصل ہوتے ہیں اور معاشرہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والوں کی کفالت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

۸۔ روسی اشتراکیت کا مقصد معاشی عدل پسندیدہ ہے لیکن طریق کار سراسر ناقص اور خلاف اسلام ہے۔

۹۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ مغربی افکار و نظریات سے متاثر ہونے کی بجائے قرآن مجید کی تعلیمات پر غور و خوض کریں اس کی مدد سے وہ اپنی تمام مشکلات کا حل تلاش کر لیں گے۔